Tauseeq, Volume. 6, Issue. 2
ISSN (P) 2790-9271 (E) 2790-928X
DOI: https://doi.org/10.37605/tauseeq.v6i2.3

Received: 10-10-2025
Accepted: 05-12-2025
Published: 30-12-2025

اردو شاعری میں مابعد نوآبادیاتی تناظر: یوٹوپیائی امکانات اور امید کا بیانیہ

Postcolonial Perspectives in Urdu Poetry: Utopian Possibilities and the Discourse of Hope.

ڈاکٹر سید زاہد حسین کاظمی*

Abstract:

In Urdu poetry, the postcolonial perspective unfolds as a space that reveals layers of imperial oppression, identity and resistance while also envisioning utopian hopes. It is not just a story of wounds but a search for dreams and renewal. Thinkers like Edward Said, Fanon, and Gayatri gave this discourse global scope which critics such as Nasir Abbas Nayyar, Bloch, Ngugi, Graham Hegun and Jameson further enriched. In Hali, Shibli, and Iqbal's vision, liberation from colonial rule emerges as a dream while Faiz, Josh, and Makhdoom turn poetry into a metaphor of resistance and justice. After Partition, migration and identity shaped new themes while modern poets like Kishwar Naheed, Zehra Nigah and Ahmad Faraz etc. redefined protest through gender, minority and ecological perspectives. This study therefore, not only introduces a new direction in Urdu literary criticism but also positions Urdu poetry as a vital reference point within global interpretations of postcolonial literature.

Keywords: Urdu poetry, Postcolonial Perspective, Imperial Domination, Identity and Resistance, Utopia, Hope, Global Postcolonial Discourse, Partition Literature, Urdu Poets, Gender, Minority and Ecological Perspectives, Literary Criticism

* وائس پرنسپل: اسلام آباد ماڈل کالج برائے طلباء سٹریٹ 17 آئی ٹین ون اسلام آباد

اردو شاعری کی روایت جمالیاتی اظہار کے ساتھ ہمیشہ سے فکری اور تہذیبی مسائل کی ترجمانی کرتی رہی ہے یعنی یہ حسن اور احساسات کے ساتھ فکر اور معاشرتی گفتگو کا ذریعہ بنی۔اس طرح یہ تعلق زمانے کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی دباؤ کے ساتھ بڑھتا رہا۔ برصغیر کی نوآبادیاتی تاریخ نے اردو شاعری کو ایک ایسے تجربے سے روشناس کیا جس میں مزاحمت، شکست، امید اور نئے امکانات یکجا دکھائی دیتے ہیں۔ نوآبادیاتی عہد میں طاقت کے ڈھانچوں نے نہ صرف زبان و بیان بلکہ فطرت اور انسانی شعور کی تشکیل نو کی کوشش کی اور وہ اس میں کافی حد تک کامیاب بھی رہی۔ جس سے اردو شاعری نے انگریزی شاعری سے کئی پہلو مستعار لئے اور ان اثرات کو اپنے تاریخی و تہذیبی پس منظر کے مطابق نئی معنویت دی۔ رومانوی انگریزی شاعری نے جس طرح فرد کی باطنی کیفیات، فطرت سے وابستگی اور آزادی کے خواب کو شعری سطح پر مجسم کیا۔اس کی بازگشت میر اور غالب سے ہوتی ہوئی اقبال تک پہنچتی ہے۔اقبال نے اس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے ''خودی'' اور ''شاہین'' جیسے پُر معنی استعاروں کے ذریعے ایک نیا یوٹوپیائی تصور پیش کیا جو محض قومی نہیں بلکہ انسانی تہذیب کی تعمیر کا عالمی خواب تھا۔ بعد ازاں فیض، جوش اور جالب نے انگریزی شعری روایت کی تکنیک اور علامتوں سے رہنمائی حاصل کر کے استعمار کے خلاف مزاحمت کو شعری پیکر میں ڈھالا۔ اسی اثر کے زیرِ سایہ اردو میں آزاد نظم اور نثری نظم کے تجربات سامنے آئے جنھوں نے اظہارِ خیال کی نئی راہیں کھولیں۔ یوں اردو شاعری نے نہ صرف انگریزی شاعری سے اثر قبول کیا بلکہ اسے اپنے فکری و ثقافتی سیاق میں جذب کر کے آزادی، عدل اور روشن مستقبل کے خواب کو اپنی شعری روایت کا جزوِ لازم بنا دیا۔ اس طرح اردو شاعری نے ایک طرف استعمار کے جبر کے خلاف احتجاجی لہجہ اختیار کیا تو دوسری جانب مستقبل کے خواب اور ایک بہتر دنیا کی تلاش کو اپنی تخلیقی بنیاد بنایا۔

مابعد نوآبادیاتی تنقید نے ادبی مطالعات میں اس سوال کو مرکزیت دی کہ محکوم اقوام کس طرح اپنی شناخت، آزادی اور امید کو شعری اظہار کا حصہ بناتی ہیں۔ اردو شاعری اس زاویے سے ایک منفرد ورثہ رکھتی ہے کیونکہ یہاں ماضی کی شکست اور غلامی کے زخم کے ساتھ ساتھ مستقبل کے امکانات اور اجتماعی امید کا بیانیہ اپنے جوبن پر نظر آتا ہے۔ اقبال کے "تصورِ خودی" سے لے کر فیض کے "خوابِ آزادی" تک اور جدید شعرا کے عہد سے لے کر نئی نسل کی تخلیقات تک اظہار کا ایک ایسا شعری میدان موجود ہے جو نوآبادیاتی جبر کے خلاف مزاحمت کے ساتھ ساتھ یوٹوپیائی امکانات کو بھی آواز دیتا ہے۔ "یوٹوپیا" ایک فلسفیانہ اور ادبی اصطلاح ہے جسے سب سے پہلے سر تھامس مور نے اپنی کتاب "Utopia" میں سن 1516ء میں پیش کیا۔ یہ لفظ یونانی زبان کے دو حصوں کا مرکب ہے جس کے معنی "ایسی جگہ جو موجود نہیں ہے۔ "یوٹوپیا" سے مراد ایک خیالی اور مثالی تصوراتی معاشرہ ہے جہاں غربت، ناانصافی اور ظلم کا وجود نہ ہو۔ جہاں سارے انسان برابر اور امن و خوشحالی کے ساتھ زندگی گزاریں۔ یوٹوپیا کے ذریعے مفکرین اور ادیب مثالی مستقبل کی جھلک دکھاتے ہیں۔ اس کے برعکس "ڈسٹوپیا"

ایک ایسا تصور ہے جو ایک خوفناک اور غیر منصفانہ معاشرے کو بیان کرتا ہے۔ جہاں جبر، عدم مساوات، غربت اور انتشار پر مبنی معاشرہ ہو۔ "یوٹوپیا" امید اور مثالی سوچ کی علامت ہے جبکہ "ڈسٹوپیا" انسانی سماج کے اندیشوں اور برائیوں کی تصویر ہے۔ اردو شاعری کے مابعد نوآبادیاتی مطالعے میں اب تک زیادہ تر زور نوآبادیاتی جبر اور شکست کے تجزیے پر رہا ہے جبکہ امید اور یوٹوپیائی تصور ابھی تک ایک کم دریافت شدہ موضوع ہے اس لئے یہ موضوع علمی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ تحقیق کے ذریعے اس بات کی وضاحت کی جاسکتی ہے کہ اردو شاعری صرف احتجاج کا بیانیہ نہیں بلکہ ایک تخلیقی قوت بھی ہے جو مستقبل کی تعمیر اور اجتماعی خوابوں کو ادب کی زبان عطا کرتی ہے۔ اس طرح یہ مطالعہ نہ صرف اردو تنقید میں ایک نئی سمت فراہم کرے گا بلکہ عالمی سطح پر مابعد نوآبادیاتی ادب کی تعبیرات میں اردو شاعری کو ایک مؤثر حوالہ بھی بنائے گا۔

مابعد نوآبادیاتی فکر بیسویں صدی کی علمی و ادبی تنقید کا ایک اہم پہلو ہے جس کی بنیاد براہِ راست استعمار کے تجربات اور اس کے بعد کی فکری کشمکش سے وابستہ ہیں۔ اگرچہ نوآبادیاتی جبر کے خلاف آوازیں خود محکوم اقوام کے شعرا، ادبا اور مفکرین نے اپنے اپنے وقت میں بلند کیں۔ تاہم اسے منظم تنقیدی ڈھانچے کی صورت اس وقت ملی جب مغرب اور مشرق کے علمی مراکز میں نوآبادیاتی تجربے کو ایک نظریاتی اور ادبی مسئلہ بنا کر زیرِ بحث لایا گیا۔ اس فکر کی بنیاد میں یہ سوال کارفرما تھا کہ استعمار نے استعمار زدہ کی زبان، ثقافت، تاریخ اور حتیٰ کہ ان کی "فکر" کو کس طرح اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ ایڈورڈ سعید کی کتاب اورنیٹلیزم (Orientalism) جو 1978ء میں شائع ہوئی یہ اس سلسلے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے جس میں یہ واضح کیا گیا کہ مشرق کو مغرب نے محض ایک جغرافیائی یا تہذیبی شناخت کے طور پر نہیں بلکہ طاقت اور غلبے کی سیاسی حکمتِ عملی کے طور پر تسلط قائم کیا۔ ایڈورڈ سعید لکھتے ہیں:

> "یہ پھیلاؤ ایک خواہش اور ارادہ سے بھی عبارت ہے جو صرف اظہار کا محتاج نہیں بلکہ اس کا مقصد ایک مختلف دنیا کو سمجھنا اور بیشتر صورتوں میں اس پر تسلط قائم کرنا۔ اس کے بارے میں منصوبہ بندی کرنا اور بالآخر اسے اپنے اندر تمدنی، معاشرتی، سیاسی اور معاشی طور پر سمو لینا ہے۔"(۱)

استعماری تہذیبی آمیزش یا ثقافتوں کا پھیلاؤ صرف علمی اظہار یا مشاہدے تک محدود نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے ایک گہری خواہش اور منصوبہ بندی کارفرما تھی۔ استعمار کا مقصد تھا کہ مشرقی دنیا کو نہ صرف سمجھا جائے بلکہ اس پر قابو پایا جائے اور پھر اسے مغربی تہذیب، سیاست، معیشت اور سماجی ڈھانچوں کے مطابق ڈھالا جائے یعنی یہ پھیلاؤ صرف علم حاصل کرنے کے لیے نہیں تھا بلکہ طاقت اور تسلط کے لیے بھی تھا۔ ہومی بھابھا نے "Hybridization" ، "Mimicry" اور "Third Space" جیسے تصورات کے ذریعے یہ بتایا کہ

نوآبادیاتی طاقت محض جبر نہیں بلکہ نئی ثقافتی صورتوں کی پیدائش کا ذریعہ بھی بنی۔ گیاتری چکرورتی اسپِوک نے محکوم طبقے کی خاموشی اور ان کی دبی ہوئی آواز پر سوال اٹھا کر اس فکر کو مزید گہرائی بخشی۔ مابعد نوآبادیاتی فکر کی ارتقائی صورت صرف مغربی مفکرین کے ذریعے نہیں بنی بلکہ افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کے ادیبوں اور شعرا نے بھی اس کو جِلا بخشی۔ نگیوگی وا تھیونگو نے ڈی-کالونائزنگ دی مائنڈ (The Decolonizir the Mind) میں یہ واضح کیا کہ نوآبادیاتی جبر سب سے پہلے زبان اور فکر کو متاثر کرتا ہے۔اسی طرح جنوبی ایشیا میں اردو اور دیگر زبانوں کے ادیبوں نے بھی سامراج کے خلاف مزاحمتی ادب تخلیق کیا جو بعد میں مابعد نوآبادیاتی تنقید کا حصہ سمجھا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ فکر نوآبادیاتی جبر کے تجزیے تک محدود نہ رہی بلکہ اس نے موجودہ دور کے مسائل جیسے گلوبلائزیشن، ماحولیاتی بحران، سرمایہ دارانہ استعمار اور ثقافتی اجارہ داری کو بھی اپنے دائرے میں شامل کیا۔ آج مابعد نوآبادیاتی فکر محض نوآبادیاتی زخموں کی بازیافت نہیں بلکہ ایک ایسا تنقیدی زاویہ ہے جو مستقبل کے امکانات، نئی شناختوں اور اجتماعی امید کے بیانیے کو بھی ادبی اور فکری بحث کا حصہ بناتا ہے۔

مابعد نوآبادیاتی تنقید کا موضوع اُن بڑے مفکرین سے متعلق ہے جنہوں نے بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے آغاز میں نوآبادیاتی فکر کے خلاف علمی و تنقیدی بیانیہ تشکیل دیا۔ان میں ایڈورڈ سعید، فرانز فینن، ہومی کے۔ بھابھا، گایتری چکرورتی اسپِوک اور گراہم ہیگن کی آراء خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان نظریہ سازوں نے استعمار کے نفسیاتی، ثقافتی اور لسانی اثرات کو نہ صرف آشکار کیا بلکہ اس کے خلاف ایک متبادل فکری زاویہ بھی فراہم کیا۔ جو ادب، فن اور شاعری میں نئے امکانات کی جستجو کو جنم دیتا ہے۔ایڈورڈ سعید نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف اورنیٹلیزم (Orientalism) میں مشرق کو مغرب کی علمی، فکری اور تہذیبی تشکیل کا مصنوعی تخیل قرار دیا۔ان کے مطابق استعماری طاقتیں علم، تاریخ اور ادب کے ذریعے مشرق کو ایک "غیر" یا "دیگر (Other) " کے طور پر پیش کرتی ہیں تاکہ اپنی بالادستی کو مضبوط بنا سکیں۔اردو شاعری کے مابعد نوآبادیاتی مطالعے میں ایڈورڈ سعید کا یہ نکتہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہاں بھی سامراجی بیانیے کے خلاف "خود کی بازیافت (Recovery of Self) " کا عمل دکھائی دیتا ہے جو امید اور یوٹوپیائی خواب کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ایڈورڈ سعید کے مطابق استعمار اپنی "علمی و ثقافتی بالادستی" کے ذریعے استعمار زدہ کو اپنے بیانیے کا اسیر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "موجودہ دور میں پالیسی پر اثر انداز ہونے والے علوم یا تمدن کی طاقت نے یہ نقطہ نظر کہ "ہم" کیا کرتے ہیں یا "وہ" کیا نہیں کر سکتے اور کیا نہیں سمجھ سکتے جیسا کہ "ہم" سمجھتے ہیں اور کرتے ہیں" (۲)

آج کے دور میں بھی طاقتور تہذیبیں اور علوم پالیسی سازی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ طاقت اکثر "ہم" اور "وہ" کی تقسیم پیدا کرتی ہے۔

"ہم" کو برتر اور زیادہ عقل و فہم رکھنے والا تصور کیا جاتا ہے، جبکہ "وہ" کو کم تر، ناقص یا نااہل دکھایا جاتا ہے۔اس طرح علمی اور تہذیبی طاقت دوسروں کی شناخت اور صلاحیتوں کو محدود کرتی ہے اور اپنے غلبے کو جائز ثابت کرتی ہے۔ سر سید نے اسی علمی جبر کے مقابلے میں ایک ایسا تعلیمی اور سائنسی شعور اجاگر کیا جس نے محکوم قوم کو نوآبادیاتی "Orientalist" بیانیے سے نکلنے کا راستہ دکھایا۔ یہ استعمار کے علمی غلبے کے خلاف ایک فکری مزاحمت تھی جو امید اور یوٹوپیائی امکانات کو زندہ رکھتی ہے۔ ہومی بھابھا کے "Hybridization" اور "Third Space" کے نظریے کو سامنے رکھا جائے تو سر سید اور حالی کے افکار اسی "درمیانی مقام" کو تشکیل دیتے ہیں۔وہ مکمل طور پر نوآبادیاتی جدیدیت کو قبول بھی نہیں کرتے اور اسے رد بھی نہیں کرتے بلکہ ایک ایسا بیانیہ بناتے ہیں جو ماضی کی علمی روایت اور مغربی جدیدیت کے درمیان ایک نئی تہذیبی ترکیب پیدا کرتے ہیں ۔یہی "Hybrid Space" مستقبل کے لیے ایک مثبت اور تخلیقی میدان فراہم کرتی ہے۔ اسپِوک "Subaltern" تھیوری کی بحث کے تناظر میں حالی کی شاعری اور نثر بھی اہم ہو جاتی ہے کیونکہ وہ محکوم قوم کو ایک "آواز" دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کا مقصد یہ تھا کہ نوآبادیاتی غلامی کے احساسِ کمتری میں ڈوبی ہوئی قوم کو اپنے وجود اور اپنی آواز کی بازیافت کرائی جائے۔اس میں یوٹوپیائی امکانات اور نظریۂ امید واضح نظر آتا ہے۔ان کا ابتدائی بیانیہ اصلاح یا جدیدیت کی ابتدا نہیں بلکہ ایک مابعد نوآبادیاتی تخلیقی عمل ہے جس نے استعمار کے بیانیے کو کمزور کرتے ہوئے اردو شعری روایت کو ایک ایسا تنقیدی و امید افزا زاویہ دیا جو بیسویں صدی کے ترقی پسندوں اور جدید شعرا تک جا پہنچا۔ یہ بیانیہ استعماری جبر کے سامنے نئے مستقبل کے خواب کی بنیاد فراہم کرتا ہے جو اردو شاعری کے مابعد نوآبادیاتی تناظر میں ایک لازمی ستون ہے۔

ہومی بھابھا نے مابعد نوآبادیاتی فکر میں (Hybridization) اختلاط، (Mimicry) تقلید یعنی نقل کرنا اور (Third Space) تیسری جگہ جیسے تصورات متعارف کرائے۔ بھابھا کے نزدیک محکوم اقوام نہ صرف استعماری اقتدار کی نقل کرتی ہیں بلکہ اس عمل میں اسے مضحکہ خیز اور کمزور بھی بناتی ہیں۔ "تیسری جگہ" کا تصور دراصل نوآبادیاتی شناخت کے بیچ سے نکلنے والی اُس تخلیقی جگہ کی نشاندہی کرتا ہے جہاں نئی زبان، نئی معنویت اور نئی امید جنم لیتی ہے۔اردو شاعری میں اس تصور کا عکس اُس وقت ملتا ہے جب شاعر استعماری اور مقامی روایات کو ملا کر ایک نئے تنقیدی اور یوٹوپیائی امکان کو اجاگر کرتا ہے۔ سی ایل انس لکھتے ہیں :

"Like Said and Spivak, Bhabha celebrates the 'hybridity' of postcolonial cultures."

" سعید ، اسپواک اور بھا بھا بھی مابعد نو آبادیاتی ثقافتوں میں موجود تہذیبی آمیزش (Hybridity) کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔" (۳)

ایڈورڈ سعید، گیاتری اسپواک اور ہومی بھابھا نے مابعد نو آبادیاتی تہذیبی آمیزش کو تحریک آمیز قرار دیتے ہوئے نو آبادیاتی بیانیے کی ساخت کو بے نقاب کیااور محکوم آوازوں کی نمائندگی پر زور دیا۔ ہومی بھابھا نو آبادیاتی دور کے ثقافتی تناظر میں "ہائبرڈیٹی" کے اختلاط کو پسند کرتے ہیں بلکہ وہ اسے ایک تخلیقی اور مثبت قوت سمجھتے ہیں۔ ہومی بھابھا کے نزدیک ثقافتی آمیزش صرف دو تہذیبوں کا ملاپ نہیں بلکہ ایک ایسا پیچیدہ عمل ہے جو استعمار اور مقامی سماجی تعامل سے پیدا ہوتا ہے۔اس تہذیبی آمیزش سے ایسے نئے فکری زاویے پیدا ہوتے ہیں جو ماضی و حال متحرک ثقافتی حقیقت کا اظہاریہ بنتے ہیں یہ تہذیبی آمیزش نو آبادیاتی تجربات کو آشکار کرتی ہے۔ گیاتری چکرورتی اسپوک نے مابعد نو آبادیاتی فکر میں "Subaltern" کے سوال کو مرکزی اہمیت دی۔ ان کے نزدیک استعماری اور پدر شاہی ڈھانچے نے محکوم اور پسے ہوئے طبقات کی آواز کو دبا دیا ہے۔ ان کی مشہور تحریر Can the Subaltern Speak? اس سوال کو اٹھاتی ہے کہ کیا حاشیہ پر موجود طبقات اپنی آواز کو اصل معنوں میں بیان کر سکتے ہیں؟ اردو شاعری میں یہ فکر اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب شاعر کمزور طبقات، خواتین اور حاشیہ بردار گروہوں کے دکھ درد کو نہ صرف پیش کرتا ہے بلکہ ان کے لیے ایک نئی امید اور انصاف کے خواب کو بھی بُننے کی کوشش کرتا ہے۔

گراہم ہیگن ایک اہم مابعد نو آبادیاتی نقاد ہیں جنہوں نے اپنی کتاب "The Postcolonial Exotic" میں لکھا ہے کہ کس طرح نو آبادیاتی ادب مغربی دنیا میں ''اجنبی پن'' کے طور پر مارکیٹ میں پیش ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ادب کو صرف متن کے طور پر نہیں بلکہ اس کی پیداوار، اشاعت اور کھپت کے حوالے سے دیکھا گیا ہے۔ انہوں نے ماحولیاتی نو آبادیات پر زور دیتے ہوئے بتایا کہ ماحول، حیوانات اور ادب کے مباحث بھی استعمار اور سامراجی سرمایہ داری کے تسلسل سے جڑے ہیں۔ گراہم ہیگن نے مابعد نو آبادیاتی مطالعے میں لسانیات اور شناخت کے مسائل کو گہرائی سے پرکھا۔ ان کے مطابق زبان نو آبادیاتی طاقت کا سب سے بڑا ہتھیار رہی ہے لیکن یہی زبان محکوم اقوام کے لیے مزاحمت اور آزادی کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مابعد نو آبادیاتی ادب ایک ایسا متحرک بیانیہ ہے جو ماضی کی غلامی اور حال کی مزاحمت کے درمیان مستقبل کی امید کو جنم دیتا ہے۔ اردو شاعری میں زبان کا یہی تخلیقی استعمال یوٹوپیائی امکانات کو سامنے لاتا ہے۔ مذکورہ نظریہ سازوں کی آراء نہ صرف مابعد نو آبادیاتی تنقید کی نظریاتی بنیاد فراہم کرتی ہیں بلکہ اردو شاعری میں یوٹوپیائی امکانات اور امید کے بیانیے کو سمجھنے کے لیے فکری رہنمائی بھی کرتی ہیں۔ ان کے تصورات اردو شاعری کو محض ایک جمالیاتی تجربہ نہیں رہنے دیتے بلکہ اسے ایک نظریاتی، تنقیدی اور مزاحمتی قوت میں ڈھال دیتے ہیں جو مستقبل کی تشکیل اور سماجی انصاف کے خواب سے منضبط ہے۔

مابعد نو آبادیاتی فکر کے بنیاد گزاروں میں مغربی دانشور ایڈورڈ سعید، فرانز فینن، ہومی بھابھا، گیاتری چکرورتی اسپوک وغیرہ کے نام وابستہ ہے لیکن اردو تنقید میں بھی اس کی بازگشت نمایاں طور پر سنائی دیتی ہے۔ یہاں ایسے ناقدین نے نہ صرف مغربی فکر سے استفادہ کیا بلکہ

اسے برصغیر کے مخصوص تاریخی، ثقافتی اور لسانی تناظر میں برتا اور اردو شاعری کے تنقیدی مطالعے کے لیے نئی راہیں ہموار کیں۔ان میں ناصر عباس نیر اور گوپی چند نارنگ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ناصر عباس نیر نے اردو تنقید میں مابعد نوآبادیاتی نظریے کو علمی اور منظم سطح پر متعارف کرایا۔ان کی تحریروں میں یہ نکتہ بار بار سامنے آتا ہے کہ نوآبادیات نے محض سیاسی یا عسکری سطح پر ہی نہیں بلکہ فکری، لسانی اور تہذیبی سطح پر بھی محکوم اقوام کی شناخت کو مجروح کیا۔ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:

"آباد کاروں نے اپنے بیانیے کے ذریعے قائم اور رائج کی گئی محدود شناختوں کے ثقافتی استعماری ثمرات سمیٹے۔"(۴)

استعمار نے بیانیے کی طاقت سے ایسی شناختیں وضع کیں جو مقامی لوگوں کی اصل وسعت اور تنوع کو محدود کر دیتی تھیں۔یہ شناختیں تعریفی نہیں بلکہ ایک حکمتِ عملی تھی جن کے ذریعے آبادکاروں یعنی استعمار نے اپنے غلبے کو ثقافتی طور پر جواز دیا اور اس کے ثمرات سمیٹے۔ دراصل یہ بیانیہ اقتدار کا آلہ تھا۔ انہوں نے اپنی تنقید میں اس بات کو اجاگر کیا کہ اردو ادب اور خصوصاً شاعری کس طرح استعماری ذہنیت کے خلاف مزاحمت کرتی ہے اور "خودی کی بازیافت" کا عمل شروع کرتی ہے۔ان کے نزدیک اردو شاعری محض جذباتی اظہار نہیں بلکہ ایک ایسا فکری عمل ہے جو شناخت، آزادی اور انصاف کے امکانات سے مربوط ہے۔اس طرح ان کی تنقید اردو شاعری میں یوٹوپیائی خواب اور امید کے بیانیے کو سمجھنے کے لیے ایک مضبوط فکری بنیاد فراہم کرتی ہے۔

گوپی چند نارنگ نے اردو تنقید میں مابعد جدیدیت، ساختیات اور مابعد نوآبادیات کے مباحث کو اس انداز میں پیش کیا کہ وہ اردو کے کلاسیکی اور جدید دونوں ادب سے مربوط ہو گئے۔انہوں نے مابعد نوآبادیاتی فکر کو ایک درآمد شدہ مغربی نظریہ نہیں سمجھا بلکہ اس کی جڑیں برصغیر کی اپنی علمی و فکری روایت میں بھی تلاش کیں۔ان کے نزدیک اردو شاعری میں مابعد نوآبادیاتی تناظر اس وقت زیادہ واضح ہوتا ہے جب شاعر سامراجی جبر کے مقابلے میں اپنی تہذیبی و روحانی وراثت کو سامنے لاتا ہے اور تخیل کے ذریعے مستقبل کے امکانات کا نقشہ کھینچتا ہے۔ان کی آراء اردو شاعری میں امید اور مزاحمت کے بیانیے کو تاریخی و ثقافتی ربط کے ساتھ جوڑتی ہے۔اسی طرح دیگر ناقدین نے بھی اردو تنقید میں مابعد نوآبادیاتی مباحث کو آگے بڑھایا ہے۔کچھ نے زبان کو استعماری طاقت کے ہتھیار کے طور پر دیکھا اور یہ استدلال پیش کیا کہ اردو شاعری نے زبان کے تخلیقی استعمال کے ذریعے سامراجی بیانیے کو توڑنے کی کوشش کی۔کچھ نے حاشیہ بردار طبقات، عورتوں اور کمزور گروہوں کی شاعری کو مرکز میں لا کر یہ دکھایا کہ مابعد نوآبادیاتی فکر صرف سیاسی آزادی تک محدود نہیں بلکہ سماجی و ثقافتی انصاف کا بھی تقاضا کرتی ہے۔ناصر عباس نیر اور گوپی چند نارنگ جیسے ناقدین نے مابعد نوآبادیاتی تنقید کو اردو تنقیدی روایت کا حصہ بنایا اور اردو شاعری میں

موجود ان تخلیقی امکانات کو نمایاں کیا جو سامراجی ورثے کے بوجھ کے باوجود ایک نئے اور روشن مستقبل کی نوید دیتے ہیں۔ان کے مباحث اردو شاعری کو ایک جمالیاتی تجربے کے ساتھ تاریخ، سیاست، ثقافت اور امید سے جڑی ہوئی ایک زندہ تنقیدی روایت کا حصہ بنا دیتے ہیں۔

"یوٹوپیا" اور "امید" انسانی فکر کے ایسے تصورات ہیں جو تاریخ کے ہر دور میں تخیل، خواہش اور مستقبل کی جستجو سے وابستہ رہے ہیں۔ یہ دونوں خیالی یا تجریدی اصطلاحات نہیں بلکہ انسان کے باطنی امکان کی نمائندگی کرتے ہیں جو اسے موجودہ جبر، مایوسی اور ناانصافی سے نکل کر ایک بہتر اور منصفانہ دنیا کے خواب کی طرف مائل کرتا ہے۔ فلسفیانہ اور ادبی سطح پر اِن تصورات کو مختلف مفکرین نے اپنے مخصوص تناظر میں پیش کیا ہے لیکن ان سب کا بنیادی نکتہ یہی ہے کہ انسان اپنی حقیقت سے زیادہ اپنی امکاناتی صورت میں زندہ رہتا ہے۔ جرمن فلسفی ارنسٹ بلوخ (Ernst Bloch) نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف (The Principle of Hope) میں امید کو انسانی شعور کا بنیادی جوہر قرار دیا۔ بلوخ کے نزدیک انسان ہمیشہ "Not-Yet" یعنی "ابھی تک نامکمل" کی کیفیت میں زندہ رہتا ہے۔ وہ اپنے حال کو مستقبل کی ممکنہ صورتوں سے باندھ کر سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک یوٹوپیا ایک خیالی جنت نہیں بلکہ ایک "عملی امکان" ہے جو انسانی تخیل، محنت اور جدوجہد کے ذریعے وجود میں آسکتا ہے۔ بلوخ کے ہاں امید تسلی نہیں بلکہ ایک "انقلابی قوت" ہے جو فرد کو خواب دیکھنے اور خواب کو حقیقت بنانے کی ترغیب دیتی ہے۔امریکی ماہر ادب اور فلسفی فریڈرک جیمسن (Fredric Jameson) جو کہ مابعد جدیدیت اور مارکسی تنقید پر اپنی تحریروں کی وجہ سے مشہور ہیں انہوں نے "یوٹوپیا" کو بالخصوص ادبی اور ثقافتی تنقید کا مرکز بنایا۔ان کے نزدیک ہر ادبی متن میں ایک "یوٹوپیائی تمنّا" چھپی ہوتی ہے جو براہِ راست نہ سہی مگر علامتی یا استعارتی صورت میں مستقبل کی ایک مختلف دنیا کی جھلک دکھاتی ہے۔ جیمسن نے کہا کہ وہ ادب جو بظاہر سماجی جبر یا سرمایہ داری کی عکاسی کرتا ہے وہ بھی اپنے اندر کسی متبادل دنیا کی خواہش کو چھپائے رکھتا ہے۔ان کے نزدیک ادب یوٹوپیائی امکانات کا خفیہ خزانہ ہے جو قاری کو موجودہ صورتِ حال سے آگے بڑھنے کی تحریک دیتا ہے۔

برطانوی ادبی نقاد اور فلسفی ٹیری ایگلٹن (Terry Eagleton) کا تعلق مارکسی تنقید سے ہے انہوں نے ادب، فلسفہ، کلچر اور مذہب پر کام کیا۔ انہوں نے یوٹوپیا اور امید کو ادبی جمالیات اور اخلاقی فلسفے کے تناظر میں دیکھا۔ان کے نزدیک "امید" مستقبل کی توقع کے ساتھ ایک "اخلاقی ذمہ داری" بھی ہے۔ادب کے ذریعے انسان اپنے دکھوں اور جبر کو نہ صرف بیان کرتا ہے بلکہ ایک ایسے مستقبل کا خواب بھی تراشتا ہے جو انصاف، برابری اور انسان دوستی پر مبنی ہو۔ایگلٹن کے نزدیک یوٹوپیا کوئی غیر حقیقی خواب نہیں بلکہ ایک "تنقیدی تصور" ہے جو موجودہ نظام پر سوال اٹھاتا ہے اور قاری کو بہتر دنیا کی جستجو پر آمادہ کرتا ہے۔ان کی مشہور کتابوں میں "An Introduction of Literary Theory" اہم ہے کیونکہ یہ نصاب کا حصہ بنی۔ اردو شاعری کے سیاق میں ان مفکرین کی آرا سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہمارے شعرا نے اپنے تخیل، علامتوں اور استعاروں کے ذریعے امید اور یوٹوپیا کے تصور کو ہمیشہ تازہ اور متحرک رکھا۔ میر و

غالب کے عہد سے اقبال اور فیض تک یہ شعری روایت اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ امید محض فرد کے دل کا سہارا نہیں بلکہ سماجی و فکری تبدیلی کی محرک قوت بھی ہے۔ اردو شاعری میں "یوٹوپیا" ایک ایسے تخیلاتی منظر نامے کے طور پر سامنے آتا ہے جہاں محبت، انصاف اور مساوات کی فضا قائم ہو۔ جب کہ "امید" وہ داخلی روشنی ہے جو شاعر کو ظلمت و جبر کے اندھیروں میں بھی نغمہ گو اور حق گو بنائے رکھتی ہے۔

"امید" انسانی شعور کی وہ بنیادی قوت ہے جو مایوسی، جبر اور ناممکن کے اندھیروں میں بھی روشنی کا راستہ کھولتی ہے۔ فلسفہ اور ادب دونوں میں یہ تصور ہمیشہ انقلابی تحریکوں اور فکری بغاوت کا محرک رہا ہے۔ مابعد نوآبادیاتی تناظر میں امید کا نظریہ صرف فرد کا نفسیاتی سہارا نہیں بلکہ ایک ایسی اجتماعی توانائی ہے جو سامراجی بیانیے کو چیلنج کرتی ہے اور محکوم اقوام کو اپنی نئی شناخت تشکیل دینے پر آمادہ کرتی ہے۔ استعماری بیانیہ ہمیشہ اس بنیاد پر قائم رہتا ہے کہ استعمار زدہ اپنے آپ کو کمتر، عاجز اور محکوم سمجھیں۔ یہ بیانیہ ثقافتی بالادستی، علمی اجارہ داری اور لسانی برتری کے ذریعے ذہنوں پر قابض ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن امید کا تصور اس بیانیے کے خلاف ایک ایسا متبادل تصور ہے جس میں استعمار زدہ اپنے وجود کی قدر، تاریخ کی عظمت اور مستقبل کے امکاناتی پہلوؤں کو دیکھنا شروع کر دیتا ہے اس طرح "امید" محض ایک جذباتی کیفیت نہیں رہتی بلکہ ایک فکری ہتھیار بن جاتی ہے۔ اردو شاعری اس حوالے سے ایک شاندار مثال پیش کرتی ہے۔ اقبال نے اپنے اشعار میں امید کو "خودی" کی بیداری اور ملت کی تشکیلِ نو کے ساتھ جوڑا۔ ان کے نزدیک امید وہ قوت ہے جو غلامی کے اندھیروں میں بھی ایک نئی صبح کی نوید سناتی ہے۔ اقبال کا تصورِ امید فرد اور قوم دونوں کو ایک ایسے مستقبل کی طرف لے جاتا ہے جہاں تخیل، عمل اور یقین یکجا ہو کر استعمار کے مقابلے میں ایک متبادل بیانیہ تشکیل دیتے ہیں۔ پروفیسر عالم خوندمیری لکھتے ہیں:

> "اقبال کے کلام کے ایک حصے نے یقیناً مشرق کے Myths کو طاقت بخشی ہے اور مشرق و مغرب کے تصادم میں ایک غیر متوازن فضا پیدا کی ہے۔"(۵)

اقبال کی شاعری نے مشرقی روایات اور اساطیر (Myths) کو تقویت دی۔ اس کے نتیجے میں مشرق اور مغرب کے درمیان اختلاف اور کشمکش مزید نمایاں ہوئی اور دونوں کے درمیان ایک طرح کی غیر متوازن فضا پیدا ہو گئی۔ دوسرے لفظوں میں اقبال نے مشرقی اقدار کو ابھار کر مغربی برتری کے بیانیے کو چیلنج کیا۔ جس سے تصادم کی کیفیت پیدا ہوئی۔ ان کی شاعری میں "شاہین" کا استعارہ اسی امید کا مظہر ہے جو بلند پروازی، خود اعتمادی اور آزادی کا استعارہ بن کر سامنے آتا ہے۔ اسی طرح "خودی" کا فلسفہ محکوم ذہنیت کو توڑ کر ایک نئے انسان کی تعمیر کرتا ہے جو استعمار کی شکست کی ضمانت ہے۔ اقبال کے ہاں یوٹوپیائی امکانات خواب نہیں بلکہ ایک حقیقت پر مبنی تحرک آمیز تصور ہے۔ ان کے "مردِ مومن" کا تصور دراصل وہ نیا انسان ہے جو ماضی کی غلامی کو توڑ کر اپنے وجود کی تعمیر کرتا ہے اور مستقبل میں عدل، مساوات اور آزادی پر مبنی ایک نئے جہاں کی تشکیل کرتا ہے۔

تعلیمات اسلامی میں "امید" ہی وہ زینہ ہے جو فرد کو مایوسی سے بچاتا ہے اور آگے بڑھنے کی تحریک دیتا ہے۔اس لئے کہا گیا ہے۔" لاتقنطو من رحمت اللہ "یعنی اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو۔اسی طرح فیض احمد فیض نے ظلم اور جبر کے ماحول میں ایسے شعری استعارے تخلیق کیے جن میں سامراجی بیانیہ اپنی تمام تر سختی کے باوجود شکست خوردہ دکھائی دیتا ہے کیونکہ شاعری میں "کل" کا خواب زندہ رکھا جاتا ہے۔ فلسفیانہ سطح پر ارنسٹ بلوخ کی "Principle of Hope" اور ایگلٹن کی اخلاقی تنقید یہ واضح کرتی ہے کہ امید ایک "عملی امکان" ہے یعنی ایسا خواب جو محض تصور میں نہیں بلکہ انسانی عمل میں حقیقت بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔جب یہ فکر ادب میں ڈھلتی ہے تو استعماری بیانیہ اپنی بنیاد سے متزلزل ہو جاتا ہے کیونکہ وہ استعمار زدہ پر حاکمیت قائم رکھنے کے لیے مایوسی اور بے بسی کو مستقل حالت بنانا چاہتا ہے۔"امید" اس جمود کو توڑتی ہے اور محکوم اقوام کو بتاتی ہے کہ استعمار کی "ہمیشہ رہنے والی طاقت "ایک فریب کے سوا کچھ نہیں۔"امید" کا نظریہ مابعد نوآبادیاتی دنیا میں سامراجی بیانیے کی شکست کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔یہ استعمار زدہ کے لیے نہ صرف نئی فکری آزادی پیدا کرتا ہے بلکہ انہیں اپنی شاعری، ادب اور ثقافت میں ایک نئے یوٹوپیائی تصور کی تعمیر کا حوصلہ بھی بخشتا ہے۔اردو شاعری میں یہ تصور ہمیشہ تبدیلی اور روشنی کا امکان رکھتا ہے۔

انیسویں صدی کی اردو شاعری برصغیر کے سیاسی اور تہذیبی افق پر نوآبادیاتی جبر کے سائے میں تشکیل پائی۔ برطانوی استعمار کی مداخلت نے نہ صرف معاشی اور سماجی ڈھانچے کو تہ و بالا کیا بلکہ فکری و تخلیقی فضا کو بھی گہرے بحران سے دوچار کیا۔اردو شاعری کا نوآبادیاتی پس منظر برصغیر کی فکری، تہذیبی اور سیاسی تاریخ کا نہایت اہم باب ہے۔ برطانوی استعمار نے جہاں سیاسی و معاشی ڈھانچوں کو بدلا اور زبان و ادب پر گہرے اثرات ڈالے۔ فارسی کی سرکاری حیثیت ختم کر کے انگریزی کو دفتری اور علمی زبان بنانا دراصل ایک ایسا اقدام تھا جس نے اردو کی تہذیبی بقا کو چیلنج کیا۔ ان حالات میں اردو شاعری جمالیاتی اظہار کے ساتھ اپنی تہذیبی شناخت کے تحفظ اور مزاحمت کی علامت بن گئی۔ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد شاعری میں شکست، محرومی اور غم کے ساتھ ساتھ ایک نئے عزم اور امید کے استعارے بھی ملتے ہیں۔ سرسید نے عقلیت، سائنسی شعور اور جدید تعلیم کو قوم کی نجات کے لیے لازمی قرار دیا۔ان کے نزدیک نوآبادیاتی جبر سے نکلنے کا راستہ صرف مزاحمت نہیں بلکہ ایک ایسا فکری و تعلیمی ڈھانچہ تیار کرنا تھا جو قوم کو عالمی سطح پر عزت اور وقار دلا سکے۔

حالی کی مسدس نے اصلاحی اور تہذیبی بیداری کا بیانیہ قائم کیا۔ حالی نے "مدو جزرِ اسلام" کے ذریعے نوآبادیاتی پس منظر میں اصلاح اور فکری تجدید کا بیانیہ قائم کیا جس نے قوم کو شکست خوردگی سے نکالنے اور تہذیبی شناخت کو زندہ رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔"مقدمہ شعر و شاعری" میں قوم کے زوال کی وجوہات بیان کی گئیں اور ساتھ ہی اصلاح، اخلاقی تربیت، اجتماعی شعور کو بحال کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا جبکہ اقبال نے "تصورِ خودی" کے ذریعے غلامی کے اندھیروں میں ایک نئی روشنی ڈالی۔انہوں نے استعمار کے خلاف شعور کی سطح پر سب سے

مؤثر شاعری تخلیق کی۔ان کا تصورِ خودی اور پیغامِ حیات غلامی کے اندھیروں میں مزاحمت، خود اعتمادی اور مستقبل کی تعمیر کے امکانات کو زندہ کرتا ہے۔اقبال کی شاعری دراصل سامراجی بیانیے کے مقابلے میں امید اور یوٹوپیائی امکانات کی فکری بنیاد فراہم کرتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے شعرانے نوآبادیاتی سرمایہ داری اور اس کے مظالم کے خلاف آواز بلند کی۔انہوں نے انصاف، مساوات اور آزادی کے خواب کو شعری تخیل کا حصہ بنایا۔اس طرح اردو شاعری نے نوآبادیاتی جبر کے مقابلے میں احتجاج کا بیانیہ تخلیق کیا اور ایک "یوٹوپیائی" دنیا کے خواب کو بھی زندہ رکھا۔ان کا بیانیہ اردو تنقید میں مابعد نوآبادیاتی مباحث کی فکری بنیاد بنا اور شاعری، شناخت کی بازیافت، امید، مزاحمت کا موثر ذریعہ بنایا۔ ترقی پسند تحریک کے شعرانے نوآبادیاتی سرمایہ داری، سماجی ناہمواری اور استحصالی ڈھانچوں کو ہدف بنایا۔ فیض احمد فیض کی شاعری نے جبر اور تاریکی کے بیچ بھی "صبح" کے استعارے سے امید اور انقلابی خواب کو زندہ رکھا۔ان کے ہاں سامراجی بیانیہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار نظر آتا ہے کیونکہ وہ شعری تخیل کے ذریعے ایک ایسی دنیا کی جھلک دکھاتے ہیں جہاں آزادی، انصاف اور برابری ممکن ہے۔ جدید دور کے شعرا نے بھی اس روایت کو آگے بڑھایا اور مابعد نوآبادیاتی فکر کے ساتھ نئی علامتوں اور تجربات کے ذریعے مزاحمت اور امید کے بیانیے کو تقویت بخشی۔

اردو شاعری کے مختلف ادوار میں اکبر الہ آبادی، حالی سے لے کر اقبال، فیض اور جدید شعرا تک ایک ایسا تسلسل قائم نظر آتا ہے جس نے نوآبادیاتی جبر کو نہ صرف رد کیا بلکہ مستقبل کے امکانات کو شعری جمالیات کے ساتھ جوڑ کر ایک زندہ اور مزاحمتی روایت کو فروغ دیا۔ یہ ایک ایسا بیانیہ ہے جس میں امید، اصلاح اور آزادی کی خواہش کے ساتھ یوٹوپیائی امکانات روشن کئے۔ جس نے شعرا کو ایک ایسے تخیل کی طرف متوجہ کیا جس میں آزادی، نجات اور ایک بہتر مستقبل کی جستجو پوشیدہ تھی۔ شبلی کی فکر میں ماضی کی شاندار روایات کے احیاء کے ذریعے مستقبل کے امکانات روشن کرنے کا تصور ملتا ہے۔غالب کی شاعری میں اگرچہ داخلی شکست اور وجودی اضطراب نمایاں ہیں لیکن اس کے پس پردہ ایک ایسا تخیلاتی رویہ موجود ہے جو نئے معنوی امکانات کو جنم دیتا ہے۔اس تناظر میں یہ شاعری "نظریۂ امید" کے تحت سامراجی بیانیے کی شکست کی ابتدائی صورت بنتی ہے کیونکہ اس میں مایوسی کے اندھیروں کے باوجود ایک نئے، آزاد اور باوقار مستقبل کا خواب موجود ہے جو مابعد نوآبادیاتی یوٹوپیائی فکر کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔یعنی ایک ایسی امید اور تصورِ مستقبل جس میں مسلمان اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو نئے علمی و فکری راستوں کے ذریعے دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔ دونوں شخصیات اردو شاعری اور نثر میں مابعد نوآبادیاتی تناظر کے اندر امید، تبدیلی اور جدیدیت کے ایسے امکانات پیدا کرتی ہیں جو نہ صرف انیسویں صدی بلکہ بیسویں صدی کے ترقی پسند اور جدید رجحانات کے لیے بھی فکری بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ اقبال کی شاعری برصغیر کے مابعد نوآبادیاتی فکری تناظر میں ایک ایسا ادبی سرمایہ ہے جس میں استعمار کے خلاف فکری مزاحمت اور امید کے امکانات دونوں نمایاں ہیں۔ علامہ اقبال نے استعمار اور غلامی کے اندھیروں میں ایک روشن اور آزاد

مستقبل کا خواب کچھ یوں دکھایا:

"نہیں ہے نااُمید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی"(۶)

نوآبادیاتی پس منظر میں امید اور یوٹوپیائی امکان کا اظہار ہے۔ غلامی اور شکستہ حالی کے باوجود اقبال اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اگر تھوڑی سی محنت، قربانی اور ایمان کی نمی شامل ہو تو محکوم قومیں بھی ایک بار پھر عروج اور آزادی کی راہوں پر گامزن ہو سکتی ہیں۔ اقبال نے محض سیاسی آزادی کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ استعمار کی تہذیبی و فکری بالادستی کو بھی للکارا۔ ان کے نزدیک نوآبادیاتی جبر صرف سیاسی محکومی تک محدود نہ تھا بلکہ یہ ذہنی غلامی، خود اعتمادی کے زوال اور روحانی جمود کی شکل میں ظاہر تھا۔ استعمار کی سب سے بڑی شکست اس وقت ہوئی جب استعمار زدہ نے اپنے باطن میں چھپی "خودی" کو پہچانا۔ استعمار کا اصل مقابلہ بیرونی طاقت سے زیادہ اندرونی کمزوری اور غلامانہ ذہنیت سے تھا جسے اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے اس شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ ان کے کلام میں امید ایک خیالی تصور نہیں بلکہ ایک عملی اور انقلابی قوت ہے۔

فیض احمد فیض کی شاعری میں نوآبادیاتی جبر کے خلاف مزاحمت ایک جمالیاتی اور امید افزا بیانیہ اختیار کر لیتی ہے۔ ان کے ہاں محبت اور انقلاب باہم منسلک ہیں۔ "ہم دیکھیں گے" جیسی تخلیقات مقامی استعمار کے خلاف احتجاج اور مستقبل کی یوٹوپیائی تصویر ہے جہاں ظلم و استحصال کے بعد آزادی، عدل اور انسانی وقار کی بالادستی ہو گی۔ اس حوالے سے ان کی یہ نظم بہت نمایاں ہے:

"ہم دیکھیں گے جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی سب تاج اُچھالے جائیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے اور اہلِ حکم کے سر اوپر سب تخت گرائے جائیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے جب بجلی کڑ کڑ کڑکے گی بس نام رہے گا اللہ کا
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے جب ارضِ خدا کے کعبے سے جو غائب بھی ہے حاضر بھی
جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں سب بُت اُٹھوائے جائیں گے جو منظر بھی ہے ناظر بھی
روئی کی طرح اُڑ جائیں گے ہم اہلِ صفا، مردودِ حرم اور راج کرے گی خلقِ خدا

ہم محکوموں کے پاؤں تلے مسند پہ بٹھائے جائیں گے جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو"(۷)

یہ نوآبادیاتی اور آمرانہ جبر کے خلاف امید، مزاحمت اور یوٹوپیائی مستقبل کا بیانیہ ہے جہاں ظلم کا نظام مٹ جائے گا اور عدل وانصاف پر مبنی نیا دور قائم ہوگا۔ جوش ملیح آبادی کی شاعری میں استعمار دشمنی کا اظہار زیادہ براہِ راست اور خطیبانہ انداز میں ملتا ہے۔ وہ استعمار کو نہ صرف سیاسی جبر بلکہ تہذیبی غلامی کی علامت سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے برطانوی سامراج اور غلامی کے ماحول میں ہمیشہ آزادی اور ایک روشن مستقبل کا خواب دکھایا۔ ان کا یہ شعر اس پہلو کو واضح کرتا ہے:

"کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آآ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں دوڑو کہ وہ ٹوٹی زنجیریں"(۸)

جوش کے انقلابی اشعار محکوم اقوام کی اجتماعی امنگوں کی ترجمانی کرتے ہوئے "امید" کو عمل میں ڈھالنے کی تحریک پیدا کرتے ہیں۔ مخدوم محی الدین کی شاعری میں سامراج دشمنی اور یوٹوپیائی تصور دونوں کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ وہ محبت اور انقلاب کو ایک دوسرے کی تکمیل سمجھتے ہیں۔ ان کے اشعار میں مزدور، کسان اور محکوم طبقات کی آزادی کا خواب ایک ایسے مستقبل کی صورت اختیار کرتا ہے جہاں طبقاتی استحصال کا خاتمہ اور مساوات پر مبنی سماج کا قیام ممکن ہو۔ ان کا رومانی انقلابی رویہ استعمار کے خلاف جدوجہد کو ایک انسان دوست اور پرامید بیانیہ بنا دیتا ہے۔ ترقی پسند شعرا کی شاعری سامراج دشمنی کو محض نفی تک محدود نہیں رکھتی بلکہ اس کے ساتھ ایک ایسا مثبت تصور بھی فراہم کرتی ہے جو مابعد نوآبادیاتی فکر کے مطابق امید اور یوٹوپیائی امکانات کا سرچشمہ ہے۔ یہ شعرا محکوم قوم کے دل ودماغ میں نہ صرف مزاحمت کا شعور بیدار کرتے ہیں بلکہ ایک نئے، آزاد اور عادلانہ مستقبل کے خواب کو ادبی اور فکری رنگ بھی عطا کرتے ہیں۔

اردو شاعری میں مزاحمت ایک ایسا تخلیقی وفکری تسلسل ہیں جو استعمار اور جبر کے خلاف اجتماعی شعور کو صورتِ اظہار عطا کرتا ہے۔ استعمار نے قوموں کو سیاسی اور معاشی طور پر محکوم بنایا لیکن شعری اظہار نے اس محکومی کے بیچ آزادی کے خواب کو زندہ رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں مزاحمت احتجاجی ردعمل کے ساتھ ایک جمالیاتی اور فکری جہت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ شاعری میں مزاحمت کی صورت کبھی انقلابی نعروں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی علامتی واستعاراتی پیرائے میں۔ آزادی کے خواب کو شعری پیکر میں ڈھالنے والے شعرا قوم

کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ غلامی دائمی نہیں اور ہر ظلم کے بعد صبح روشن ہے۔انصاف کے خواب نے بھی اردو شاعری میں مرکزی مقام حاصل کیا۔یہ انصاف محض عدالتی یا قانونی معنی میں نہیں بلکہ سماجی، معاشی اور تہذیبی برابری کی صورت میں سامنے آیا۔ترقی پسند شعرا نے مزدور اور کسان کو استعمار اور مقامی استحصالی طبقوں کے خلاف ایک علامت کے طور پر پیش کیا اور ان کے کلام میں انصاف کا خواب ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی صورت اختیار کرتا ہے جو جبر و استحصال اور غیر مساوی رویوں سے پاک ہو۔یہی شعری اظہاریے جو امید، حوصلے اور یوٹوپیائی تصور کو جنم دیتے ہیں۔یہ مابعد نوآبادیاتی فکر کے مطابق سامراجی بیانیے کی شکست ہے اور محکوم قوموں کو نہ صرف احتجاج کا حوصلہ دیتے ہیں بلکہ ایک نئے، آزاد اور عادلانہ مستقبل کا خواب بھی دکھاتے ہیں۔

جدید اردو شاعری میں مابعد نوآبادیاتی امکانات اس حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں کہ ادب محکومیت کے تجرباتی اظہار کے ساتھ مستقبل کے امکانات کی تشکیل نو کا ذریعہ ہیں۔جس نے امید، تخلیقی جرات اور اجتماعی خودی کی تعمیر کو ممکن بنایا۔جدید شاعروں نے اپنی تخلیقات میں سامراجی اثرات سے پیدا ہونے والی شناختی کشمکش کو موضوع بنایا مگر اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے یوٹوپیائی امکانات کو بھی دریافت کیا جو ایک نئے سماجی و ثقافتی افق کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔یہ شاعری تشکیلِ نو کا استعارہ ہے جس میں نوآبادیاتی محکوم ذہن کو آزاد کرنے کا شعور کارفرما ہے۔نئی نظم اور جدید غزل نے اس تناظر میں فرد اور معاشرے کے باہمی رشتوں کو از سر نو دریافت کیا اور یہ دکھایا کہ ادب کس طرح امید اور امکان کی نئی دنیا تخلیق کر سکتا ہے۔احمد ندیم قاسمی کی شاعری آزادی اور عوامی دکھ درد سے جڑی ہے۔آزادی کا خواب کسان اور مزدور کے دکھوں کے ساتھ منسلک ہو کر ایک سماجی بندھن بناتی ہے لیکن میراجی کی شاعری زیادہ داخلی اور وجودی کرب کی نمائندہ ہے جہاں نوآبادیاتی شکست کے ساتھ فرد کی نفسیاتی شکست و ریخت نظر آتی ہے۔ن م راشد نے آزادی کے تصور کو ایک جدید اور فلسفیانہ پیرائے میں ڈھالا۔ان کے ہاں آزادی سیاسی آزادی نہیں بلکہ ذہنی و فکری بندشوں سے نجات کا نام ہے۔ان تینوں شعرا کا بیانیہ نوآبادیاتی جبر سے نکلنے کے مختلف جہتوں کو ظاہر کرتا ہے جو اجتماعی شعور سے لے کر فرد کی ذات تک پھیلا ہوا ہے۔

نئی نظم اور غزل نے شناخت کی تلاش کو ایک مستقل موضوع بنایا۔نئی غزل میں یہ احساس زیادہ شخصی اور داخلی سطح پر آیا جبکہ نئی نظم نے اسے اجتماعی اور سیاسی کرب کے ساتھ پیش کیا۔اس عہد کی شاعری میں نوآبادیاتی اثرات کو نوآبادیاتی پالیسیوں کی توسیع کے طور پر دیکھا گیا۔شاعری میں فرد اور معاشرے کی شکستگی ایک ایسی یادداشت کا حصہ بنی جو مابعد نوآبادیاتی تناظر میں استعمار کے زخموں کی نشاندہی کرتی ہے۔انتظار حسین بنیادی طور پر افسانہ نگار کے طور پر معروف ہیں مگر ان کے تخلیقی وژن نے شاعری کو بھی متاثر کیا۔ان کی تخلیقات میں تقسیم اور تہذیبی شیرازے کا بکھرنا اور ماضی کے کھو جانے، روایت کے ٹوٹنے اور شناخت کے عدم تحفظ کا دکھ نمایاں ہے۔ان کی شاعری نے بھی اسی کرب کو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے نئی معنویت اور نئی تہذیبی شناخت کے امکانات کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔جدید اردو

شعرا میں زہرہ نگاہ اور کشور ناہید نے نسائی تناظر میں مزاحمت کو نئی معنویت دی جہاں عورت کی آواز غلامی اور جبر کے خلاف ایک نئی دنیا کا خواب بنتی ہے۔احمد فراز کی شاعری میں عشق اور سیاسی احتجاج کی آمیزش ہے جو فرد اور سماج دونوں کے لیے آزادی اور انصاف کی جستجو کو زندہ رکھتی ہے۔ان شعرا کے ہاں ایک ایسا شعری اور فکری عمل ہے جو شکستہ حالات کے باوجود مستقبل کے امکانات کو زندہ رکھتا ہے۔نئی نسل کے شعرا نے مابعد نوآبادیاتی شعریات کو مزید وسعت بخشی ہے۔ان کے ہاں ہجرت، شناخت کے بحران، عالمی سامراجی ڈھانچوں اور مقامی سیاسی وثقافتی مسائل کے ساتھ ساتھ ایک ایسی یوٹوپیائی جہت بھی موجود ہے جو نئے افق دریافت کرتی ہے۔ان کے کلام میں امید اور مزاحمت ایک ساتھ چلتے ہیں اور یہ امتزاج انہیں ایک تخلیقی قوت عطا کرتا ہے۔ جس سے اردو شاعری کا مابعد نوآبادیاتی افق اور زیادہ روشن اور وسیع ہو جاتا ہے۔

اردو شاعری میں مابعد نوآبادیاتی تناظر کو سمجھنے کے لیے "یوٹوپیائی امکانات جیسے امید، خواب اور نئے افق "ایک بنیادی حوالہ فراہم کرتا ہے۔یہ شاعری غلامی اور محکومی کے تجربات کی بازگشت نہیں بلکہ ان زخموں کے پس منظر میں ایک نئے، روشن اور آزاد مستقبل کی جھلک بھی ہے۔نوآبادیاتی تجربے نے شکست وریخت اور شناختی بحران پیدا کیا جبکہ اردو شعرا نے اس بحران کو امید اور خواب کے تخلیقی سرچشمے میں بدلنے کی کوشش کی۔اس کے نتیجے میں ایسی تخلیقات سامنے آئیں جن میں مایوسی کے باوجود مستقبل کے امکانات موجود ہیں۔ شاعر اپنی شاعری کے ذریعے ایسے افق تراشتے ہیں جہاں محکومی کا احساس، آزادی کے تصور میں ڈھل کر ایک نئے سماجی اور فکری ڈھانچے کو جنم دیتا ہے۔ یہاں "امید" جذباتی کیفیت نہیں بلکہ ایک قوت متحرکہ ہے۔ جو فرد اور قوم کو اپنی بقا کے راستے دکھاتی ہے۔ اردو شاعری میں یوٹوپیائی امکانات نہ صرف نوآبادیاتی ماضی کے خلاف ایک بیانیہ تشکیل دیتے ہیں بلکہ مستقبل کی تعمیر کا اعلان بھی کرتے ہیں۔اس طرح اردو شاعری میں کلاسیکی علامتوں اور جدید فکری جہات کا امتزاج ایک مسلسل مزاحمتی اور یوٹوپیائی بیانیہ تخلیق کرتا ہے۔

اردو شاعری میں ماحولیاتی نوآبادیات (Eco-Postcolonialism) ایک نئے فکری زاویے کے طور پر ابھری ہے جو نوآبادیاتی جبر اور سرمایہ دارانہ استحصال کو فطرت اور ماحول کی تباہی کے تناظر میں بھی دیکھتی ہے۔ یہ شاعری استعماری بربریت کی علامت، انسانی قدروں کی پامالی اور فطرتی عناصر جیسے زمین، دریا، درخت اور موسم تک کی لوٹ مار کو آشکار کرتی ہے۔ جدید اردو شاعری میں ماحولیاتی شعور فطرت کی بقا اور انسانی زندگی کی ہم آہنگی کو ایک یوٹوپیائی خواب کے طور پر پیش کیا گیا۔ جہاں انسان اور ماحول باہمی احترام اور توازن کے ساتھ زندہ رہتے ہیں۔اردو شاعری نے گلوبلائزیشن اور سرمایادارانہ جبر کے مقابلے میں امید اور مزاحمت کی آواز بلند کی ہے۔ شعرا نے اپنی نظموں اور غزلوں میں اس بات کو اجاگر کیا کہ سرمایہ داری انسانیت کو مشین اور منڈی کی منطق کے تابع بنا رہی ہے لیکن اس کے باوجود امید کا خواب زندہ ہے۔ یہ شاعری ایک ایسے مستقبل کا خواب بنتی ہے جہاں گلوبلائزیشن کا مطلب صرف منڈی نہیں بلکہ انصاف، انسانی وقار اور

آزادی ہو۔اس طرح اردو شاعری میں عورت، اقلیتیں اور مظلوم طبقات کی آواز کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔نسائی شاعرات نے اپنی شاعری میں عورت کو صرف ظلم کا شکار دکھانے کے بجائے امید اور مزاحمت کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔یہ شاعری ایک ایسے مستقبل کی طرف اشارہ کرتی ہے جہاں طاقت کے غیر منصفانہ ڈھانچے ٹوٹ جائیں اور انسان اپنی اصل آزادی اور وقار کے ساتھ جی سکے۔

ڈیجیٹل عہد نے اردو شاعری کو ایک نئی جہت دی ہے جس سے مزاحمت کے امکانات وسعت اختیار کر گئے ہیں۔سوشل میڈیا، آن لائن جریدے اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز نے شاعری کو جغرافیائی حدود سے نکال کر ایک عالمی مکالمہ بنا دیا ہے۔اس کے ساتھ ہی نوآبادیاتی اور سامراجی ڈھانچوں کے خلاف نئی راہیں کھلیں۔جس کی وجہ سے حاشیے پر موجود آوازیں نے بھی اہمیت حاصل کی۔اس طرح اردو شاعری نے مابعد نوآبادیاتی تناظر میں عالمی سطح پر معنویت حاصل کی۔ترجمے، بین الاقوامی سیمینارز، آن لائن مشاعرے، ادبی مقابلے، محفلیں اور ڈیجیٹل اشاعت نے اردو شاعری کو دنیا بھر کے قارئین تک پہنچا دیا ہے۔یہ شاعری نہ صرف استعمار کے زخموں کو بیان کرتی ہے بلکہ ایک ایسی امید افزا بیانیہ بھی پیش کرتی ہے جو عالمی انسانیت کے مشترکہ خوابوں کو سمیٹتی ہے۔اس طرح اردو شاعری عالمی ادبی منظر نامے میں ایک منفرد اور مزاحمتی حیثیت رکھتی ہے۔جو مظلوم اقوام اور انسانیت کے مستقبل کے لیے روشنی کا منارہ ہے۔اردو شاعری مابعد نوآبادیاتی تناظر میں دنیا کی دیگر زبانوں کی شاعری کے ساتھ ہم قدم نظر آتی ہے۔افریقی، لاطینی امریکی اور عربی شاعری بھی استعمار، محکومی اور مزاحمت کے موضوعات سے منسلک رہی ہے۔جیسے افریقی شعرا نے غلامی اور نسل پرستی کے خلاف آواز بلند کی۔اسی طرح اردو شاعری نے سامراجی جبر اور تقسیم کے زخموں کو بیان کیا۔فرق یہ ہے کہ اردو شاعری نے مزاحمت کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ اور جمالیاتی سطح پر یوٹوپیائی امکانات اور امید کو بھی بنیادی حیثیت دی۔اس تقابلی مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اردو شاعری عالمی مابعد نوآبادیاتی ادب کے بڑے مکالمے کا حصہ ہے اور اپنی مخصوص علامتی و فکری جہات کے ساتھ اس مکالمے کو وسعت دیتی ہے۔

تحقیق سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ اردو شاعری نے نوآبادیاتی جبر اور سامراجی بیانیے کے ساتھ ایک متبادل اور بہتر دنیا کے خواب کو بھی شعری اظہار میں پیش کیا۔اقبال سے جدید شعرا تک مزاحمت اور یوٹوپیائی امکانات کی ایک مسلسل روایت قائم رہی ہے جو استعماریت کے بعد بھی اپنی معنویت برقرار رکھتی ہے۔اس تحقیق نے اس بات کو بھی اجاگر کیا کہ اردو شاعری میں مابعد نوآبادیاتی مطالعے کے لیے نئے زاویے موجود ہیں۔جن میں زبان اور شناخت کا مسئلہ، ہجرت اور جلاوطنی کے تجربات، عورت اور اقلیتوں کی شاعری میں سامراجی جبر کے خلاف بیانیہ اور ماحولیاتی نوآبادیات کی طرف بڑھتا ہوا رجحان شامل ہیں۔اردو شاعری ماضی کی یادداشت نہیں بلکہ حال اور مستقبل کے مسائل کے تجزیے اور فکری مزاحمت کا بھی موثر ذریعہ ہے جس سے مستقبل میں محققین کے لیے کئی تحقیقی سمتیں کھلتی ہیں جیسے کہ اردو شاعری میں ڈیجیٹل عہد کے اثرات، آن لائن شعری تحریروں کا نوآبادیاتی و مابعد نوآبادیاتی مطالعہ، عالمی سطح پر اردو شاعری کے

ترجمے اور اس کی بین الاقوامی قبولیت کے پہلو شامل ہیں۔اسی طرح مختلف خطوں کی مابعد نوآبادیاتی شاعری کے ساتھ اردو شاعری کا تقابلی مطالعہ بھی تحقیق کے نئے دروازے کھول سکتا ہے۔اردو تنقید میں اب تک مابعد نوآبادیاتی مطالعات زیادہ تر سامراجی جبر اور قومی شناخت تک محدود رہے ہیں۔تاہم یوٹوپیائی فکر اور ماحولیاتی امکانات پر سنجیدہ اور مربوط تحقیق کی ضرورت ہے۔یہ پہلو اردو شاعری کی نئی معنویت اور عالمی ادبی مباحث کو متعارف کروانے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔مستقبل کی تحقیق اگر ان جہات کو مرکز بنائے تو اردو شاعری کو مزید نئے فکری اور نظریاتی تناظر میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات

ا۔ایڈورڈڈبلیو،"شرق شناسی"،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،2012ء،ص: 14

۲۔سعید،ایڈورڈڈبلیو،"شرق شناسی"،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،2012ء،ص: 14

۳۔سی ایل انس ، The Cambridge introduction to post colonial literature in English،کیمرج یونیورسٹی پریس ،کیمرج 2007ء،ص: 193

۴۔نیر،ناصر عباس،"مابعد نوآبادیات اردو کے تناظر"،اوکسفرڈ،پریس،لاہور،ص:63

۵۔پروفیسر عالم خوندمیری،اقبال انسانی تقدیر اور وقت ادارہ ثقافت اسلامیہ،لاہور،۲۰۱۰ء)ص:۱۴۱

۶۔محمد اقبال،"کلیات اقبال اردو: بال جبریل،غزلیات (حصہ اول)،دگرگوں ہے جہاں،تاروں کی گردش تیز ہے ساقی"،شیخ محمد بشیر اینڈ سنز،لاہور،ص:374

۷۔فیض احمد،فیض،"نسخہ ھائے وفا: مرے دل مرے مسافر،ویبقی وجہ ربک"،کارواں پریس،لاہور،ص:655

۸۔شبیر حسن،جوش،"مجموعہ: شعلہ و شبنم،شکست کا خواب"،سن ندارد

References:

1. Saeed, Edward W., "Sharq Shanasi", Muqtadara Qaumi Zaban, Islamabad, 2012, p. 14
2. Saeed, Edward W., "Sharq Shanasi", Muqtadara Qaumi Zaban, Islamabad, 2012, p. 14
3. C.L. Innes, The Cambridge Introduction to Postcolonial Literature in English, Cambridge University Press, Cambridge, 2007, p. 193
4. Naeer, Nasir Abbas, "Ma Baad No-Aabadiyat Urdu ke Tanazur", Oxford Press, Lahore, p. 63
5. Professor Alam Khond Meri, Iqbal: Insani Taqdeer aur Waqt, Idara Saqafat-e-Islamia, Lahore, 2010, p. 141
6. Muhammad Iqbal, "Kulliyat-e-Iqbal Urdu: Bal-e-Jibril, Ghazaliyat (Hissa Awwal), Dagar-gun Hai Jahan, Taron Ki Gardish Tez Hai Saqi", Sheikh Muhammad Bashir & Sons, Lahore, p. 374
7. Faiz Ahmad Faiz, "Nuskha-ha-e-Wafa: Mere Dil Mere Musafir, Webqi Wajah Rabk", Karwan Press, Lahore, p. 655
8. Shabbir Hassan, Josh, "Majmua: Shola-o-Shabnam, Shikast Ka Khwab", (n.d)